رجوع الی اللہ ـــــ وقت کی اہم ترین ضرورت

سید منور حسن

اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر بڑا فضل اور احسان ہے، اس کی نعمتیں بے پایاں ہیں، کرم نوازیاں اور اپنی مخلوق کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیتیں ہر چہار طرف بکھری ہوئی ہیں، اپنے آپ کو منواتی اور چار دانگ عالم میں محبت اور الفت کا پیغام لے کر آتی ہیں۔ لیکن اس کے مقابلے میں بندوں کا معاملہ عجیب ہے کہ اس کے وہ بندے بھی جو بظاہر اس کو جانتے پہچانتے ہیں، اس کی کبریائی کے گن گاتے، اس کی بڑائی کو مانتے ہیں، اور اس کے اول و آخر اور ملجا و ماوی ہونے کو تسلیم کرتے ہیں مگر ان کے اعمال و افعال ان کے ایمان، عقیدے اور ان کے ذہن وفکر کی نفی کر رہے ہوتے ہیں۔ آدمی اگر دور نہ جائے اور خود اپنے اندر جھانک کر دیکھے تو یہ بات دو اور دو چار کی طرح واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ بندگی کے راستے پر چلنے والے بھی بار بار ڈگمگاتے، راہ سے بے راہ ہو جاتے ہیں، منزل کو گم کر بیٹھتے ہیں اور خود اپنی ہی شناخت اور تعارف سے محروم ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں یہ سوال اٹھتا ہے اور اٹھایا جانا چاہیے کہ ان اسباب و علل پر کیسے قابو پایا جائے جو بحیثیت مجموعی بندوں کی گمراہی اور اپنے رب سے دُور ہونے کا سبب بنتے ہیں۔

قرآن پاک اور احادیث مبارکہ میں اس موضوع پر تفصیلی ہدایات موجود ہیں، اور جزئیات تک میں رہنمائی کی گئی ہے۔ جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ انسان ناشکرا واقع ہوا ہے، بھول اور غفلت کا شکار ہو جاتا ہے، سر سے لے کر پیر تک احسان فراموش بن جاتا ہے، وہیں یہ حقیقت بھی بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت اور اس کی جبلت میں رجوع کے، اپنے رب کی طرف لوٹنے پلٹنے کے بھی کئی عنوانات سجائے ہوئے ہیں۔ اسی وجہ سے طبیعت اور مزاج میں ایک ندامت کی

کیفیت ،اور ہر غلط کام کے اوپر اپنے آپ کو ٹوکنے کا ایک جذبہ ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ ہر برائی اور گناہ پر ملول ہونے، تأسف کا اظہار کرنے اور طبیعت کے اندر ایک ہیجان کی کیفیت کے کئی حوالے سامنے آتے ہیں۔اسی کو توبہ واستغفار بھی کہا جاتا ہے اور رجوع الی اللہ بھی۔قرآن پاک میں اہل ایمان کی جو صفات بیان ہوئی ہیں ان میں پلٹنے والے، لوٹنے والے، اپنے رب کی طرف بار بار رجوع کرنے والے، اور توبہ استغفار کرنے والے کا تذکرہ بار بار ملتا ہے۔اللہ تعالیٰ کو اپنے بندے کی یہ ادا بے حد پسند ہے کہ وہ بار بار راہ سے بے راہ ہو اور بار بار اپنے رب سے رجوع کرے، اس کی طرف واپس لوٹ آئے اور وہ اس کو معاف کردے۔اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اگر تم سب (ملائکہ کی طرح) بے گناہ ہو جاؤ اور تم سے کوئی گناہ سرزد نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اور مخلوق پیدا کرے گا جن سے گناہ بھی سرزد ہوں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کا فیصلہ فرمائے گا (اور یوں اپنی شان غفاریت کا اظہار فرمائے گا)۔(مسلم)

بخاری اور مسلم میں یہ واقعہ بیان ہوا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں اور صحابہ کرامؓ حلقہ بنائے بیٹھے ہیں تا آنکہ لوگوں نے سنا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر یہ کلمہ جاری ہوا کہ اس شخص کی خوشی کا کیا حال ہوگا، اس شخص کی مسرت کا کیا حال ہوگا؟ یہ فرما کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہوگئے۔صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ہم کچھ سمجھ نہیں سکے کہ کس شخص کی خوشی اور مسرت کا آپ تذکرہ فرما رہے ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک شخص ہے، جنگل بیابان ریگستان میں چلا جاتا ہے۔وہ ہے اور اس کا اونٹ ہے، وہ خود ہے اور اس کی سواری ہے، اور اس سواری کے اوپر اس کی ساری کائنات لدی ہوئی ہے۔اس کے کپڑے، دانہ پانی، کھانے پینے کا سامان، اور اس کی ضرورت کی تمام چیزیں اس اونٹ کے اوپر موجود ہیں۔وہ مسافر جب چلتے چلتے تھک جاتا ہے تو یہ سوچ کر کہ کچھ دیر آرام کرلے، اونٹ سے نیچے اترتا ہے، اس کو کھڑا کر کے قریب ہی لیٹ جاتا ہے اور اس کی آنکھ لگ جاتی ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کچھ دیر بعد جب وہ شخص بیدار ہوتا ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ اس کا اونٹ تو وہاں ہے ہی نہیں، وہ چاروں طرف دوڑتا، گھومتا پھرتا اپنے

اُونٹ کو تلاش کرتا ہے لیکن وہ کہیں ملتا ہی نہیں۔ ہر چہار طرف اپنے اونٹ کو پکارنے کے بعد بھی جب اس کا نام ونشان نہیں ملتا تو وہ تھک ہار کر اپنی جگہ پر واپس بیٹھ جاتا ہے۔ چاروں طرف موت کے مہیب سایے اسے اپنی طرف بڑھتے نظر آتے ہیں۔ یہ خیال اسے ستانے لگتا ہے کہ اس ریگستان میں دن کی گرمی میں ہلاک ہو جاؤں گا، رات کی سردی میں مارا جاؤں گا، بھوک اور پیاس کی شدت سے اپنی جان گنوا بیٹھوں گا۔ چاروں طرف موت ہی موت اس کو نظر آتی ہے تا آنکہ زندگی سے مایوس ہو کر وہ اپنے ہاتھ کو تکیہ بناتا ہے اور پھر اسی جگہ پر پڑ رہتا ہے۔ اسی اثنا میں اس کی آنکھ لگ جاتی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چند لمحے بعد جب وہ شخص دوبارہ بیدار ہوتا ہے اور آنکھ کھول کے دیکھتا ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ اس کا اونٹ تو وہیں کھڑا ہے، واپس آ گیا ہے۔ پھر آپؐ نے اس بات کو دہرایا کہ اس شخص کی خوشی کا کیا حال ہوگا، اس شخص کی مسرت کا کیا عالم ہوگا جسے جنگل بیابان میں اپنا کھویا ہوا اونٹ واپس مل جائے۔ گویا زندگی اس کے اوپر مہربان ہو جائے، اور موت کے منڈلاتے ہوئے مہیب سایے اس سے رخصت ہو جائیں۔

ذرا غور کیجیے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ واقعہ کیوں سنایا؟ جو بات آپ اس سے آگے ارشاد فرمانے والے ہیں، جس امر سے لوگوں کو آگاہ کرنے والے ہیں۔ اصل تو وہ ہے۔آپؐ نے صحابہ کرامؓ کی طرف رخ کر کے فرمایا کہ لوگو اللہ تبارک وتعالیٰ کو اس مسافر سے جسے جنگل بیابان میں اپنا کھویا ہوا اُونٹ واپس مل جائے، کہیں زیادہ خوشی ہوتی ہے جب اس کا ایک بھولا بھٹکا ہوا بندہ، راہ سے بے راہ ہو جانے والا غفلت کا شکار بندہ، اطراف کے حالات میں اپنے آپ کو گم کر دینے اور اپنی شناخت کھو دینے والا بندہ پھر اس کی طرف لوٹتا ہے، پھر اس کی طرف پلٹتا ہے۔ پھر ندامت کے آنسو ہیں جو اس کی آنکھوں میں تیرتے ہوئے نظر آتے ہیں، اور وہ اَن گنت حوالوں سے اپنے رب کو راضی کرنے کے بہانے تلاش کرتا، طور طریقے اپناتا ہے۔

قرآن پاک اور احادیث میں تفصیل کے ساتھ یہ بات آئی ہے بالخصوص انبیاے کرام کے حوالے سے تو یہ بات بالکل دوٹوک ہے، انھی لفظوں کے اندر قرآن پاک میں موجود ہے کہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف کوئی بندہ رجوع کرتا ہے، اپنی کسی خطا اور کوتاہی کے حوالے سے معافی کا طلب گار ہوتا ہے تو یہ ادا اس کو اس قدر پسند آتی ہے کہ اس کی طبیعت اور کیفیت کے لحاظ سے

اللہ تعالیٰ اس کی زبان پر وہ کلمات جاری کر دیتا ہے، اس کے جسم و جان کے اوپر اس عمل کو طاری کر دیتا ہے جو خود اس کو بڑا مقبول ہے۔ اس کے نتیجے میں اس کی توبہ بھی قبول ہوتی ہے، اور بارگاہ رب العزت میں درجات کی بلندی بھی اس کو مل جاتی ہے۔ قرآن پاک میں نبوی دعاؤں سے اس امر کا اشارہ ملتا ہے:

رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ○ (الاعراف ۷:۲۳) اے رب ہم نے اپنے اوپر ستم کیا، اب اگر تو نے ہم سے درگزر نہ فرمایا اور رحم نہ کیا تو یقیناً ہم تباہ ہو جائیں گے۔

یہ کس کی دعا ہے؟ حضرت آدم علیہ السلام اور اماں حوا کی زبان پر یہ کلمات جاری ہیں، اپنے رب سے رجوع کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم نے اپنی جانوں پر بڑا ظلم کیا ہے، اور تیری ہی ایک ذات ہے جو مغفرت کرنے والی ہے، معاف کرنے والی ہے۔ انبیاے کرام کی جتنی بھی دعائیں ہیں، ان میں اسی کا حوالہ ملتا ہے۔

اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ○ (الانبیاء ۲۱: ۸۷)
نہیں ہے کوئی خدا مگر تو، پاک ہے تیری ذات، بے شک میں نے قصور کیا۔

یہ حضرت یونس علیہ السلام کی دعا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی زبان پر وہ کلمات جاری کرا دیے جو اس کو پسند ہیں، پھر ان کو قبول کر لیا۔

ہم اس موضوع کو کتابوں میں پڑھتے ہیں، بزرگوں سے سنتے ہیں تو خیال یہ ہوتا ہے کہ یہ کوئی دقیق علمی موضوع ہے، اور کبھی یہ گمان گزرتا ہے کہ یہ تو بڑے لوگوں کی باتیں ہیں۔ بلاشبہہ بڑے لوگوں کی باتیں تو ہیں ہی، اور علمی موضوع ہونے سے بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر ہر بندے کا اپنے رب کے ساتھ تعلق ہے، اور ہر بندے کے لیے اللہ تعالیٰ نجات کے اَن گنت عنوانات چاروں طرف بکھیرتا ہے تو پھر یہ تو میرا اور آپ کا موضوع ہے۔ کس سے گناہ نہیں سرزد ہوتا؟ کون ہے جو خطا کا پیکر ہونے سے انکار کر سکے؟ کس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ خیر و نیکی اور بھلائی و فرماں برداری کا سراپا ہے؟ سب اس بات سے واقف ہیں کہ بڑے بڑے عابد و زاہد اور مجاہد، اور قبولیت کا شرف حاصل کرنے والے کو بھی گناہ سے مفر نہیں ہے۔ نافرمانی کے

راستے پر نہ چلنا، اس پر کسی کا قابو نہیں ہے۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

ہر آدمی خطار کار ہے (کوئی نہیں ہے جس سے کبھی کوئی خطا اور لغزش نہ ہوئی ہو)، اور خطا کاروں میں وہ بہت اچھے ہیں جو (خطا اور قصور کے بعد) مخلصانہ توبہ کریں (اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرلیں)۔ (ترمذی)

انسان سے گناہ تو سرزد ہوتے ہیں، دل و دماغ بار بار نافرمانی کی آماجگاہ بن جاتے ہیں، جسم و جان کی دنیا میں ان گنت مواقع پر ایسے طوفان اٹھتے ہیں جو معصیت کی طرف لے جاتے ہیں۔ پھر اس کے بعد کیا ہوتا ہے؟ اگر انسان گناہ کر بیٹھے تو طبیعت پر کیا کیفیت طاری ہوتی ہے؟ وہ اصل مطلوب ہے۔ اگر گناہ انسان کو ملول کرے اور طبیعت کے اندر ملال کی کیفیت پیدا کرے، مزاج کے اندر محرومی کا احساس پیدا کرے تو یہ توبہ اور اپنے رب کی طرف رجوع کرنے کی کیفیت ہے۔ اس کی قدر کرنی چاہیے، اور یہ محسوس کرنا چاہیے کہ اپنے رب کی طرف سے مجھے یہ توفیق مل رہی ہے۔ اس توفیق ہی کے نتیجے میں پھر نیک اعمال کا صدور ہوتا ہے اور گناہ کے مقابلے میں انسان نیکی کی طرف بڑھتا ہے۔

ایک موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں، صحابہ کرامؓ آپ کے اردگرد بیٹھے ہیں اور ایک جنگ کے قیدی پکڑ کر لائے جارہے ہیں۔ اسی اثنا میں صحابہؓ نے دیکھا کہ ان قیدیوں میں ایک عورت بھی پکڑ کر لائی گئی ہے جو چیخ رہی ہے، چلا رہی ہے، اور بآواز بلند مسلسل کہے جارہی ہے کہ ہائے میرا بچہ! ارے میرا بچہ کہیں پیچھے رہ گیا ہے، میرا لخت جگر کہیں گم ہوگیا ہے؟ ماں کی ممتا اپنے بچے کے لیے بے چین ہے اور کہہ رہی ہے کہ مجھے تو تم یہاں قید کر کے یہاں لے آئے ہو، اس کو بھی قید کرو۔ گویا فرط محبت میں اپنے بچے کے لیے قید کی دہائی دے رہی ہے۔ صحابہ کرامؓ اس منظر کو دیکھ رہے تھے اور اس عورت کی چیخیں ان کے دل تک پہنچ رہی تھیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جو ایسے تمام مواقع پر حکمت و دانائی کے ساتھ لوگوں کی رہنمائی فرمایا کرتے تھے۔ آپؐ کی آواز فضا کے اندر گونجی، اور اس خاص لمحے جب لوگ عورت کی چیخ و پکار سن رہے تھے، آپؐ نے فرمایا کہ اے لوگو! کیا کوئی ماں اپنے بچے کو آگ میں ڈالنا پسند کرے گی؟ جب ایک ماں

کی دلدوز چیخیں سنائی دے رہی ہیں، ماں کی اپنے جگر گوشے کے لیے اٹھتی ہوئی آوازیں ہیں، اس موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو متوجہ کر کے فرمایا کہ کیا کوئی ماں اپنے بچے کو آگ میں ڈالنا پسند کرے گی؟ صحابہ کرامؓ حیران رہ گئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ کوئی ماں اپنے بچے کو کیسے آگ میں ڈال سکتی ہے، بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگو! کوئی ماں اپنے بچے سے جس قدر محبت کرسکتی ہے، پیار اور وابستگی کا اظہار کرسکتی ہے، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اس سے کہیں زیادہ مہربان ہے۔ بھلا وہ اپنے بندوں کو آگ میں ڈال دے گا؟ ہاں، بندے اس سے رجوع تو کریں، اس سے کچھ طلب تو کریں، ہاتھ پھیلا کر اس سے کچھ عرض تو کریں، دل و دماغ کی دنیا میں اسے جگہ تو دیں، سمائیں اور بسائیں تو سہی۔ گویا بندہ ایک قدم چلے تو سہی پھر دیکھے کہ اس کا رب کیسے دس قدم چل کر اس کے پاس آتا ہے۔

ہم جس ماحول اور معاشرے میں رہ رہے ہیں، اور گناہوں نے جس طرح ہر چہار طرف اپنا جال بچھا رکھا ہے، اس میں یہ اور بھی ضروری ہے کہ اپنے رب کی طرف پلٹا جائے۔ اس کو آپ رجوع الی اللہ کہیں، توبہ و استغفار کہیں، اپنے رب کی طرف لوٹنا پلٹنا کہیں، بار بار گناہوں کی طرف جانا اور بار بار نیکیوں کی طرف آنا کہیں، لیکن یہ وہ کیفیات ہیں کہ جن سے ہمیں لازماً گزرنا چاہیے۔

یہاں پر ایک سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ نے ہم کو انفرادی دائرے کے اندر کش مکش کے لیے پیدا کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ انبیاے کرام کی تعلیمات اور خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا جو اسوہ نظر آتا ہے، وہ انفرادیت کے ساتھ اجتماعیت کو بھی اللہ کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آخری حج پر تشریف لائے ہیں، عرفات کے میدان میں ہزارہا ہزار لوگ موجود ہیں، الوداعی خطبہ اور آخری ہدایات ہیں جو رہتی دنیا تک آنے والے انسانوں کے لیے آپؐ ارشاد فرما رہے ہیں۔ جب آپؐ اپنی بات مکمل فرمالیتے ہیں تو خطبے کے آخر میں پوچھتے ہیں کہ اے لوگو کیا میں نے رسالت اور دعوت کا حق ادا کردیا ہے؟ سب لوگ بآواز بلند پکار کر کہتے ہیں کہ حضور آپ نے دعوت بھی پہنچادی، پیغام بھی پہنچا دیا۔ نمونہ اس کا بتا دیا، عمل اس پر کر کے دکھا دیا۔ چاروں طرف انسانوں کا سمندر مجسم گواہی ہے، بزبان حال بھی اور بزبان قال بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات کی تصدیق کر رہا ہے۔ آپ صلی علیہ وسلم جب یہ سنتے ہیں تو

شہادت کی انگلی کو بلند تے ہیں، کبھی آسمان کی طرف اٹھاتے ہیں اور کبھی مجمع کی طرف، اور فرماتے ہیں: اللّٰھم اشھد، اللّٰھم اشھد، اے اللہ گواہ رہنا، اے اللہ گواہ رہنا۔

یہاں ایک لمحے کو ٹھیریں اور سوچیں کہ کیا یہ کام صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مختص تھا؟ اور ہم انفرادی اور چھوٹے چھوٹے دائروں میں وہ کام کرتے رہیں جو ہم کر رہے ہیں۔ اگر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ کامل نمونہ ہے تو لازم ہے کہ اس کی مکمل اتباع اور پیروی کی جائے۔ اس حوالے سے یہ بات ہمارے سامنے رہنی چاہیے کہ یہ کامل نمونہ خالص انسانی سطح پر ہے۔ ایسا نہیں تھا کہ پوری زندگی معجزات میں گزر گئی ہو، خوارق عادت چیزوں کا نمونہ بن گئی ہو۔ کون واقف نہیں ہے کہ آپؐ غم اور اندوہ کا شکار ہوتے تھے، اور ایک سال تو حزن و ملال کا سال کہلایا کہ جس میں حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ اور جناب ابوطالب کا انتقال ہوا۔ آپؐ صدمات سے دوچار ہوئے ہیں۔ آپؐ کے نوزائیدہ بیٹے اس دنیا سے رخصت ہوئے تو آنکھوں میں نمی آئی اور آنسو رواں ہوئے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ کوئی پتھر مارے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو چوٹ نہ لگتی ہو۔ کوئی کانٹے بچھائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم آرام سے گزر جاتے ہوں اور کانٹے چبھتے نہ ہوں۔ کانٹے چبھتے تھے، اپنا اثر دکھاتے تھے، پتھراؤ کے نتیجے میں جسم اطہر لہولہان ہوتا تھا، دندان مبارک شہید ہوتے تھے۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اپنوں کے لیے مسرت اور کبھی غصے کا اظہار کیا ہے۔

ایک موقع پر حضرت ابی ابن کعبؓ نے پوچھ لیا کہ آپ ہمارے لیے دعا نہیں کرتے، نصرت الٰہی کب آئے گی؟ پوچھنے والے صحابی وہ ہیں جنھوں نے شدید ترین آزمائشیں جھیلی ہیں۔ آپؐ کعبے کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے، سیدھے ہو کر بیٹھ گئے، چہرہ انور غصے سے تمتما اٹھا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے ابھی دیکھا ہی کیا ہے، تم سے پہلے جو لوگ ہو گزرے ہیں، ان کو آدھا زمین کے اندر گاڑ دیا جاتا تھا، اور باقی آدھے جسم کو آروں سے دو حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ لوہے کی کنگھیوں سے گوشت کو ان کی ہڈیوں سے جدا کر دیا جاتا تھا۔ تم جلدی کرتے ہو، عجلت کا مظاہرہ کرتے ہو۔ ان واقعات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی خالص انسانی سطح پر اگر نہ گزرتی تو اسوہ کیسے بنتا کہ جس کا اتباع کیا جاتا، جس کی پیروی کی جاتی۔

انسانی سطح پر ہی یہ بات آتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو تھکے ہوئے گھر پہنچے ہیں اور اطلاع ملتی ہے کہ ایک قافلہ آیا ہے۔ آپ فوراً تیار ہو کر اس کی طرف جانا چاہتے ہیں کہ اس کو اللہ کی طرف بلائیں، توحید کا پیغام اس تک پہنچائیں، بندگی رب کا درس اس کو دیں۔ گھر والوں نے عرض کیا کہ دن بھر کے آپ تھکے ہوئے گھر لوٹے ہیں، کل چلے جایئے گا، صبح دیکھ لیجیے گا لیکن بالکل انسانی دائرے میں آپ بات بیان فرما رہے ہیں کہ کیا عجب کہ یہ قافلہ راتوں رات ہی واپس چلا جائے یا آگے نکل جائے، یا جو مہلت عمل مجھے ملی ہے اور دعوت اور پیغام پہنچانے کی جو آزادی مجھے میسر ہے، صبح ہونے سے پہلے ہی وہ ختم ہو جائے۔

کیا یہ صرف علمی واقعات ہیں جو میں نے بیان کیے اور آپ نے پڑھے ہیں۔ علم تو ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے، اس میں تو کوئی دو رائے ہو ہی نہیں سکتیں لیکن ان میں عمل کی ایک پوری دنیا بھی آباد ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے شروع ہو کر آپ پر ختم نہیں ہوتی، بلکہ آپ کے بعد آپ کی امت کو اس کا مکلف بنایا گیا ہے اور اس کو یہ ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اس خصوصیت کو قرآن میں بیان فرمایا ہے:

> كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ (اٰل عمرٰن ۳:۱۱۰) اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

اور فرمایا:

> وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (اٰل عمران ۳:۱۰۴) تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہونے چاہییں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔

ان آیات اور حضور نبی کریمؐ کی سیرت کی روشنی میں ہمیں خود سے یہ سوال کرنا چاہیے کہ کیا ہم اپنے اعزہ واقارب، اہل خانہ، برادری اور خاندان کے بارے میں، اپنے دوست احباب

کے بارے میں، سینے پر ہاتھ رکھ کر یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ ان تک ہم نے اللہ کا پیغام پہنچا دیا ہے، دعوت کا حق ادا کردیا ہے، غلط راہوں پر جانے والوں کو بار بار متوجہ کیا اور ادھر جانے سے روکنے کی کوشش کی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اس کے بارے میں پوچھا جائے گا، سوال کیا جائے گا۔

توبہ واستغفار، رجوع الی اللہ اور بندوں کو بندوں کے رب کی طرف ہنکانے کا دائرہ ساری انسانیت کو محیط ہے۔ بلاشبہہ ہم اپنے آپ کو نظرانداز نہیں کرسکتے کہ جو واقفیت مجھے اپنی ذات سے ہے اور جو تعارف مجھے اپنے سراپا کے ساتھ ہے، وہ کسی اور کو نہیں ہے۔ اپنی اچھی اور بری عادتوں کے بارے میں ہم جانتے ہیں۔ اپنے اچھے اور برے اعمال کی فہرست ہمارے سامنے ہے۔ نفس کی جو فرمایشیں روز سامنے آتی رہتی ہیں، ان سے ہم بخوبی واقف ہیں۔ تو ہمیں اپنے لیے بھی یہ متعین کرلینا چاہیے کہ تذکیر کے جتنے عنوانات ہو سکتے ہیں وہ قلب و ذہن کی دنیا میں سجائے جائیں اور اپنے رب کی طرف پلٹنے اور اس سے رجوع کرنے کے جتنے حوالے ہوسکتے ہیں ان سب کو مضبوط کیا جائے، لیکن پورے معاشرے کو اللہ کی طرف رجوع کرانا بھی ہماری ذمہ داری ہے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ کا تقاضا ہے۔

یہ کہنا آسان ہے کہ معاشرہ بگڑ گیا ہے لیکن جس زبان سے یہ جملہ نکلتا ہے اسی کی یہ سب سے زیادہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اس بگاڑ کو دور کرے۔ اس نے تو تشخیص کر لی کہ معاشرہ بگڑا ہوا ہے، اور حالات کی خرابی کا شکار ہے۔ یہ کہہ کر گھر میں سکون کے ساتھ بیٹھ جانا داعی کے شایانِ شان نہیں ہے۔ یہ لوگوں سے دوری اور بے زاری کی کیفیت ہے جو اسوہ حسنہ کی پیروی کرنے والے کے لیے زیبا نہیں ہے۔ معاشرے کی خرابی کی اصل وجہ ہی یہ ہے کہ نصیحت ختم ہوگئی ہے اور وعظ و تلقین کا راستہ ترک اور منکر پر ٹوکنا بند کردیا گیا ہے۔ ایسی محفلوں میں ہم شریک ہوتے ہیں جن میں برائیاں 'جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے' کا عنوان ہوتی ہیں، منکرات چاروں طرف دکھائی دیتی ہیں۔ طبیعت اور مزاج کے اندر تھوڑی بہت گرانی تو پیدا ہوتی ہے لیکن رویے اور زبان کے اندر کم کم کوئی ایسی چیز سامنے آتی ہے جو لوگوں کو اصلاح کی طرف لے جاسکے، ان میں حالات کی خرابی کا ادراک پیدا کرسکے۔

ہم جن دنیوی مسائل کا رونا روتے ہیں۔ ایک شخص دوسرے شخص سے ملتا ہے تو کہتا ہے کہ

صاحب چار گھنٹے بجلی نہیں تھی، رات کو تو نیند ہی نہیں آئی۔ اس قدر شدید حبس تھا کہ کیا بتلاؤں، اور ابھی تو اپریل کا معاملہ ہے، جون جولائی میں پتا نہیں کیا کیفیت ہوگی۔ جواب ملتا ہے کہ میرے ہاں بھی پانچ گھنٹے بجلی نہیں تھی، نہ پوچھو کہ میرا کیا حال ہوا۔ آدمی حیرانی سے منہ تکنے لگتا ہے کہ اچھا تمھارا بھی یہی معاملہ ہے۔ یہ جو بجلی کے بحران کی ہم بات کرتے ہیں، گیس کی لوڈشیڈنگ، مہنگائی و بے روزگاری اور بدامنی کے عفریت کا رونا روتے ہیں، صنعتوں کے بند ہونے، تجارت کے ختم ہونے اور کسانوں کے بے حال ہونے کی دکھ بھری کہانیاں سنتے سناتے ہیں۔ تنخواہ دار کہتے ہیں کہ گھر کے اندر تین تین تنخواہیں آتی ہیں لیکن گزارہ نہیں ہوتا۔ چادر پیر کی طرف لے جاؤ تو سر کھل جاتے ہیں، سر کی طرف لے جاؤ تو پیر کھل جاتے ہیں، اس لیے کہ تنخواہیں جتنی ہیں اتنی ہی رہتی ہیں اور مہنگائی صبح اور شام میں اپنے آپ کو دوگنا چوگنا کر لیتی ہے۔ یہ تو چند مسائل کا ذکر ہے لیکن ان کی فہرست تو طویل ہے جس سے میں اور آپ واقف ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ان کا کوئی دنیوی حل ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ توبہ واستغفار اور رجوع الی اللہ ہی ان تمام مسائل کا اصل حل، اور زندگی کو بہتر رخ پر ڈالنے اور حالات کو کل سے بہتر آج اور آج سے بہتر کل کا عنوان بنانے کا راستہ ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

> جو بندہ استغفار کو لازم پکڑلے (اللہ تعالیٰ سے برابر اپنے گناہوں کی معافی مانگتا رہے) تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے ہر تنگی اور مشکل سے نکلنے اور رہائی پانے کا راستہ بنا دے گا۔ اس کی ہر فکر اور پریشانی کو دور کرے گا، اسے کشادگی اور اطمینان عطا فرمائے گا اور ان طریقوں سے رزق دے گا جن کا اس کو خیال و گمان بھی نہ ہوگا۔ (احمد)

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> اللہ تعالیٰ نے میری امت کے لیے دو امانیں مجھ پر نازل فرمائیں۔ (سورۂ انفال میں ارشا فرمایا گیا) کہ اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کرے گا کہ تم ان کے درمیان موجود ہو اور ان پر عذاب نازل کردے۔ اور اللہ انھیں عذاب میں مبتلا نہیں کرے گا جب کہ وہ استغفار کرتے ہوں گے، معافی اور مغفرت کے طلبگار ہوتے ہوں گے۔ آپؐ نے فرمایا: پھر جب میں گزر جاؤں گا تو قیامت تک کے لیے تمھارے درمیان استغفار کو (بطور امان)

چھوڑ جاؤں گا۔(ترمذی)

توبہ واستغفار اور رجوع الی اللہ کی یہ تحریک ہی ہمیں مسائل کی دلدل سے نکال سکتی ہے۔ یہ تحریک کسی دکھاوے اور نمود و نمایش اور کسی خانہ پری اور رپورٹ کی تیاری کے لیے نہیں بلکہ طبیعت کے ابال اور بندوں کو آگ سے بچانے کے داعیے کے ساتھ ہونی چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر انفرادی دائرے میں اپنے رب سے رجوع کا کوئی حوالہ موجود ہو تو چاروں طرف کے حالات میں جب لوگ راہ سے بے راہ ہو رہے ہیں تو ان کے لیے بھی یہ کیفیت خود بخود پیدا ہو جائے گی۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے جس کا قرآن پاک میں ذکر کیا گیا ہے:

طٰهٰ ۝ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۝ اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۝ (طٰهٰ ۲۰:۱-۳) ہم نے یہ قرآن تم پر اس لیے نازل نہیں کیا ہے کہ تم مصیبت میں پڑ جاؤ۔ یہ تو ایک یاددہانی ہے ہر اس شخص کے لیے جو ڈرے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ یہ قرآن پاک ہم نے اس لیے نازل نہیں کیا کہ تم مشقت کے اندر پڑ جاؤ، تمھارا حال تو یہ ہو گیا ہے کہ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (الشعرا ۲۶:۳) "شاید تم اس غم میں اپنی جان کھو دو گے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے"۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کیفیت ہے کہ لوگوں کے غم کے اندر گھلے جا رہے ہیں کہ یہ راہ سے بے راہ اور گمراہ ہو گئے ہیں، یہ بات کو سنتے اور جانتے نہیں ہیں، مانتے اور پہچانتے نہیں ہیں۔ عمل کی دنیا میں کسی انقلاب کے لیے آمادہ و تیار نہیں ہوتے ہیں۔ گویا اپنی اور لوگوں کی دنیا اور آخرت کی فکر کرنا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ ہے۔ ناگزیر ہے کہ انفرادی دائرے میں بھی اس کی پیروی کی جائے، اور اجتماعی دائرے میں بھی ہر شخص اپنی اس ذمہ داری کو محسوس کرے، اور دعوت اور رجوع الی اللہ کی تحریک کا دست و بازو بنے۔ اسی میں ہمارا دنیاوی مستقبل محفوظ ہے، اسی کے اندر آخرت کی کامیابی، اللہ تعالیٰ کی رضا اور جنت کی ضمانت ہے، اور اسی کے نتیجے میں شفاعت مصطفیٰ اور دیدار الٰہی کی توقع کی جاسکتی ہے۔